انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون ۔ ۶۰
قیمت فی پرچہ [illegible]
[illegible]

تاریخ اشاعت
۱-۷-۱۵-۶۴

جلد ۲۳ - شمارہ ۲۲	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۸ جون سنہ ۱۹۶۴ء

اداریہ

کیا گیا - کیا رہ گیا

جواہر لال نہرو تو چلے گئے۔ اُن کا جسم خاکی تو ۲۸ مئی کو شانتی گھاٹ پر شعلوں کی نذر ہو گیا۔ اُن کی راکھ بھی آج کچھ سنگم میں بہادی جائے گی اور اس طرح اُن کی وصیت کے مطابق گنگا کا جزو بن کر خلیج بنگال میں جا ملے گی اور بحر ہند کے پانی میں گھل مل کر ہندوستان کے ساحلوں کی حفاظت کرتی رہے گی۔ کچھ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے دریاؤں میں بہادی جائے گی اور اس طرح پھر سمندر میں پہنچ جائے گی۔ کچھ ہوائی جہاز سے فضا میں بکھیر دی جائے گی تاکہ اُس کے ذرے ہندوستان کے کھیتوں پر برسیں اور نئی فصل اور نئی بہار کا وسیلہ بنیں۔ اُن کا وہ ہنستا ہوا چہرہ، یوں آنکھوں میں بسا رہے گا، مگر وہ تو نہ ہوں گے، شخص تو چلا گیا۔ ہاں اُس کی شخصیت کی عظمت، کردار کی بلندی، کارناموں کی رفعت، خوابوں کی گرمی، مزاج کی نرمی یاد آتی رہے گی، اور رہتی دُنیا تک سب کے لئے ایک نور کی کرن کی طرح روشن رہے گی اور سب کو انسانیت کی منزل تک پہنچنے کے لئے اُکساتی رہے گی۔

مگر جواہر لال ہمیں کیا کچھ نہیں دے گئے۔ دیکھئے اُنھوں نے اپنے متعلق کیا کہا تھا:-

”یہ وہ آدمی تھا جس نے دل و جان سے ہندوستان سے اور ہندوستان کے عوام سے محبت کی۔ اور اس کے بدلے میں اُنھوں نے بھی اس پر بڑی مہربانی کی اور بڑی سیر چشمی اور فیاضی سے اُسے اپنی محبت دی۔“

ایک اور جگہ اپنے ماتم گساروں سے کہا تھا:-

اس وقت کام کرنے کی ضرورت ہے، اس وقت محنت کرنے کی ضرورت ہے، اس وقت امن کی ضرورت ہے، باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ اُن ساری قوتوں کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے جو قوم میں ہیں تاکہ قوم کے عظیم کام میں لگائی جا سکیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو صحیح ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔

پھر بھی، جب میں اپنے گرد و پیش نظر ڈالتا ہوں تو کام کا ماحول نہیں دیکھتا، وہ نفسیات نہیں پاتا جو کام کرنے سے بنتی ہے۔ صرف باتیں، تنقید اور دوسروں کو گرانا اور اُن میں کیڑے ڈالنا، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں اور ایسی ہی دوسری باتیں ہیں یہ چیزیں سبھی طبقوں میں پاتا ہوں۔ اوپر بھی اور نیچے بھی، نئی نسل میں بھی اور پُرانی نسل میں بھی۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔

اور پھر، جیسا کہ میں نے کہا، اپنی عمر کا خیال کر کے مجھے تھوڑی سی بے چینی ہوتی ہے، کیونکہ بہرحال شاید چند سال ہی اور میں جی سکوں اور میری تنہا آرزو یہ ہے کہ اپنی زندگی کے خاتمے تک، میں زیادہ سے زیادہ محنت سے کام کروں اور جب میں اپنا کام ختم کر چکوں تو مجھے ردی کے ڈھیر پر ڈال دیا جائے۔ جب میں اپنا کام ختم

اس اشاعت میں

کر چکوں، تو پھر میرے متعلق فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کام کی اور محنت کی اہمیت ہے، نہ کہ اُن لوگوں کے متعلق سوچنے کی اور چلانے کی جو اپنا کام ختم کر چکے اور رخصت ہوگئے۔"

یعنی جواہرلال جاتے جاتے ہمیں وہ تصوّرات دے گئے ہیں، اپنی بھرپور، خلاق، برگزیدہ زندگی کی وہ کھلی کتاب دے گئے ہیں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے اور جس سے اپنے لئے بہت کچھ لے سکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کی اور انسانیت کی خدمت کے لئے لٹا دیا — لٹا دیا — اور ٹھکانے لگا دیا۔

آیئے ہم بھی سچے دل سے عہد کریں کہ ہم اپنے آپ کو ہندوستان کی اور انسانیت کی خدمت کے لئے لٹا دیں گے۔ لٹا دینا ہمارا کام ہے۔ ٹھکانے لگنے کا فیصلہ وقت ہی کرے گا۔

جواہرلال نے ایک انٹرویو میں حال ہی میں کہا تھا، "سچی بات تو یہ ہے کہ میں کسی انسان کو ناپسند نہیں کرتا۔" آیئے ہم بھی عہد کریں کہ ہم انسان سے ہر حال میں ہر رنگ میں، ہر روپ اور ہر صورت میں محبّت کریں گے۔ محبّت کرنے والے کو محبت ملتی ہے اور نفرت کرنے والے کو نفرت۔ نفرت خوف کی علامت ہے، محبّت بے خوفی کی۔ پس خوف کو ترک کر کے بے خوفی اختیار کرنا چاہیئے اور اپنے راستے سے خلق اللہ کی خدمت میں لگ جانا چاہیئے۔

سیر بلین

۳۰ مئی کو جواہرلال نہرو کی سمادھی پر حاضری کا موقع ملا۔ ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے پھولوں کا ہار اُن کی سمادھی پر رکھنا تھا۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی اور کرشنا کرپلانی کے ساتھ میں وہاں پہنچا تو ہزاروں کا مجمع تھا۔ کئی شامیانے لگے ہوئے تھے۔ کہیں گیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا، کہیں گرو گرنتھ صاحب کا۔ لوگ سر جھکائے، آنکھوں میں آنسو لئے قطار میں کھڑے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے جاتے، سمادھی کے سامنے تھوڑی دیر کھڑے رہتے، کوئی ان کے ہاتھ میں تھوڑی سی گلاب کی پنکھڑیاں دے دیتا۔ انھیں آنکھوں سے لگاتے اور پھر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے۔ ہم لوگ پہنچے، پھولوں کا ہار سمادھی پر رکھا، اور دیر تک خاموش اور آبدیدہ کھڑے رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو:-

(۱) اپنے وطن سے، اپنے وطن کے عوام سے دل و جان سے محبّت کرو۔ تمھیں بھی اُن کی بے پناہ محبّت ملے گی۔

(۲) محبّت خدمت چاہتی ہے۔ خدمت میں معاوضے کی طلب نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ اپنا انعام آپ ہے۔

(۳) زندگی ایک دفعہ ملتی ہے، اس کا ایک ایک لمحہ اس طرح صرف کرو کہ مرتے وقت کہہ سکو ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

(۴) وقت کی قدر کرو اور باقاعدگی کو اپنا اصول بناؤ اس طرح تمہیں کام کے لئے زیادہ وقت ملے گا۔

(۵) ہندوستان کے پہاڑوں سے، اُس کے دریاؤں سے، اُس کی تاریخ سے، اُس کی تہذیب سے، عشق پیدا کرو۔

(۶) ماضی کا عرفان حاصل کرو، مگر ماضی میں گرفتار نہ ہو، مستقبل پر نظر رکھو۔

(۷) قومیں افراد سے بنتی ہیں، جس حد تک ہو سکے افراد کے دُکھ درد میں شریک ہو۔

(۸) نڈر بنو۔ بے دھڑک اپنی بات کہو اور بے خوفی سے اپنے راستے پر چلتے رہو۔

(۹) بچّوں میں کچھ وقت صرف کرو۔ اُن کے ساتھ تمہیں نئی زندگی ملے گی۔

(۱۰) جہالت، بیماری، غریبی کے خلاف برابر جہاد کرتے رہو، وہ آزادی بے معنی ہے جو سب کے لئے خوشی اور خوشحالی نہ لائے۔

(۱۱) گفتگو کا دروازہ کبھی بند نہ کرو۔

(۱۲) دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر ہر وقت نظر رکھو، آج دنیا اتنی چھوٹی ہو گئی ہے کہ جنوبی امریکہ میں زلزلہ آئے تو اُس کی دھمک دہلی میں محسوس ہوتی ہے۔

(۱۳) جمہوریت، غیر مذہبی ریاست اور سوشلزم یہ ہماری آزادی کے تین ستون ہیں۔

(۱۴) یاد رکھو کہ ہندوستان میں بہت سے رنگ ہیں، بہت سی زبانیں ہیں، بہت سے مذاہب کے ماننے والے ہیں ان سب رنگوں، زبانوں اور مذہبوں کا احترام کرو۔

(۱۵) انسانیت کی بقا کے لئے امن ضروری ہے۔

(۱۶) خلق خدا کی خدمت ہی انسان کا سب سے مقدس فریضہ ہے۔

یہ باتیں پچاس سال سے کہی جا رہی ہیں اور سُنی بھی جا رہی ہیں کچھ کے دلوں میں بھی اتر گئی ہیں۔ کاش سب کے دل کی دھڑکن بن جائیں۔

اُردو کی حق تلفی

اُترپردیش کے پرائمری ایجوکیشن بورڈ کانپور کے امتحانات جو میونسپل سنٹر میں امسال ہوئے ان میں علاوہ دیگر مضامین کے اُردو کا امتحان بھی لیا گیا مگر نتیجے کے فارم میں اُردو کے نمبر شامل نہیں کئے گئے جب ضابطہ آرٹیکل ۲۹ اُردو زبان کو جو مراعات دی گئی ہیں اُن کا اس نتیجے کے فارم سے ظاہر ہونا اُردو کی صریح حق تلفی ہے۔ (سیاست جدید کانپور)

سلطان احمد

حکایت باغ و چمن

آدم کی کہانی باغ سے شروع ہوئی ـــــ سامنے ایک ہرا درخت، آگ کا شعلہ دبائے کھڑا تھا۔ اور بھول چوک سے بھرا، کھنکھناتی مٹی کا یہ پُتلا، اپنی ریڑھ کی ہڈی پر تنا رہا۔ اس کے سینے میں سانس کے آنے جانے سے تلاطم ہوا۔ خواہشوں کا ہجوم، نفس نے زور پکڑا، قابو رکھنا دشوار ہو گیا۔ رفاقت کمزور تھی اور تسکین کی صورت نازک۔ شیطان ہوشیار ہو کر مسخرا نکلا۔ پوچھتا ہے، قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ باغ سے دوری اور چمن سے علیحدگی نصیب ہوئی۔ لیکن دل فریبیوں کا یہ سماں نظروں میں سمایا رہا۔ زمین کی سطح پر جنگل پہاڑ اور دریا کے سوا کیا تھا۔ محنت نے دستک دی۔ تم اسی کو جنت بناؤ۔ بخششوں کی کمی نہیں، وسعتیں کافی ہیں۔ شوق رہبر ہوا، جنت ارضی نمودار ہو گئی۔ خودداری نے معذرت کے لہجے میں للکارا ؎

گناہگار و غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

حُسنِ طلب کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ کہانی ابھی جاری ہے ـــــ اور باغ پہنچ کر ختم ہو گی۔

ترقیاتی باغبانی کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ برطانیہ آنے والے دور کا ابھی طفلِ مکتب تھا۔ عرب اپنے علوم و فنون کی برکتوں سے دُنیا کو مسخر کر چکے تھے۔ عجم ان کا مفتوح، رومتہ الکبریٰ پاش پاش۔ عین یورپ ہسپانیہ میں عربوں کی تہذیب و تمدن کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ایشیائی ممالک گھر آنگن ہو رہے تھے۔ ان کے بام و در حجازی نغموں سے معمور۔ تعمیر و ترقی کا وہ کون سا باب تھا جہاں بغداد و دمشق اور قرطبہ و غرناطہ کا سبق نہیں دُہرایا گیا۔ لیکن بابر کی فتوحات میں جس قدر جوش تھا اُسی قدر اس کی طبیعت میں باغ و چمن کا ولولہ۔ وہ تلوار و قلم دونوں کا دھنی تھا۔ محبت اور شفقتوں میں اتنا بھرپور کہ بیٹے کی خاطر اپنی جان بھی دے دی۔ اس نے ہند فتح کر لیا مگر دل لگانا دشوار ہوا۔ یہاں کوئی شہر اس کی پسند و معیار کا نہ تھا۔ قرینے کے بازار تھے نہ ایوان و محل رہائش کی ضرورتوں سے خالی و عاری۔ نہریں مفقود، حمام اور سراؤں کے نشان کہاں؟ وہ گھبرایا اور اس کے ساتھی اس سے زیادہ پریشان ہوئے۔ لو اور گرمیوں سے مرنے لگے۔ سپاہیوں میں بددلی پھیلی، وطن لوٹنے پر مصر ہوئے۔ بابر جانتا تھا، ایک دن برس پڑا۔ ہم نے خون بہا کر اس ملک کو فتح کیا، اس لئے نہیں کہ لوٹ جائیں۔ اگر موسم موافق نہیں تو ہم موسم پر قابو پائیں گے اور یہیں کا بل بنائیں گے اب کس کے منہ میں زبان تھی، نقشہ نظروں کے سامنے تھا۔ تعمیر شروع ہوئی، آبادیوں کو رونق ملی اور ہر طرف باغ و چمن لہلہانے لگے۔

اِدھر ہند میں مغلیہ دور کی بہاریں تھیں۔ اُدھر برطانیہ میں جدید ترقی کی لہریں آئیں۔ قوموں کے عروج و اقبال کو ان کی تہذیب و معاشرت ہی مستند اور مستحکم بناتی ہیں۔ باغ کی بہاروں سے بخت و دولت کا ثبوت ملتا ہے۔ شاد کامیوں کی انتہا، لالہ و گل کی ابتدا ہے۔ انگریزی گلاب کا ایک پھول، پوری قوم کے جوشِ عمل اور ولولۂ نہیں کو بتانے کے لئے کافی ہے۔ زندگی کا سُراغ پانا چاہو تو باغ و چمن سے پوچھو۔ انگریزی باغات کی دھوم کہاں نہیں۔ یہ باغ برطانی معاشرت کے نشان ہیں۔ زمین کا چپہ چپہ گلشنوں، پارکوں اور باغوں سے بھرا ہے۔ ان میں زندگی رواں دواں ہے۔ آبادی کا وہ کون رقبہ ہے جو چھوٹے بڑے درختوں سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ مکانات راستے، گرد پیشے، دریچے اور کھڑکیاں بھی حسین و جمیل برتنوں کی سجاوٹ سے آراستہ ہیں۔ جن میں یہ جاندار پودے کھڑے مُسکراتے ہیں۔ ایسی جگہوں میں بھی جہاں زمین کا وصل دشوار ہو، اقلیدس کی شکلوں کے معلقات موجود ہیں، جن پر درختوں کی لتیں اور محرابیں آویزاں ہیں ان سے عبارت آرائیوں کا کام لیتے ہیں۔ اور موقع و محل کے مطابق ایسے فقرے اور جملے منقوش ہوتے ہیں کہ نظر پڑتے ہی دلوں میں اتر جائیں۔ طویل راہوں کا سایہ دار ہونا اور باغیچوں کا ہواؤں میں تیرتے رہنا یا نہروں اور دریاؤں کا ان کے زیرِ سایہ رواں اور جاری ہونا صرف الف لیلیٰ کی داستان سرائی ہی نہیں، اس کے باغبانی کے عملی نمونے بھی ہیں۔ ملک میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں یہ خاموش ہم نشیں نہ ہوں۔ ان میں نہ آوازوں کا شور ہے نہ حرکتوں کی رستخیز۔ نہ سکون برہم نہ اعصاب گراں، مگر نظریں شادکام اور خوشبو بیش مشامِ جاں!

باغِ عالم کی بہاریں عارضی اور خزاں رسیدہ ہوں لیکن ارماں نصیب و لطف بداماں ہوتی ہیں جب آئیں تازگی و توانائی ساتھ لائیں۔ خود مُسکرائیں، دوسروں کو ہنسائیں۔ بے جانوں میں جان ڈالیں۔ خوش وقت ہوں اور چل نکلیں۔ اس سے زیادہ ان کا بس نہیں۔ یہ کم ہے کہ

خزاں کے بعد بہار آئے۔ یہ خزاں ہی ہے کہ سوکھے اور رنگ لائے۔ خود جلے اور دوسروں کو ٹھنڈا کرے۔ کہتے ہیں کہ باغ کی بہار کو جنت کی بہاروں سے تعلق ہے۔ اسکو سمجھنے کے لئے جو صورتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں باغوں اور نہروں کا ذکر بکثرت آیا ہے۔ چونکہ ان بہاروں کو باغ و چمن سے تعلق ہے، شاید ابدی راحتوں اور مسرّتوں کا تصوّر بھی انہیں جلووں میں نمایاں ہو۔ صرف خلائے لبیط کا فرق ہے، یہ زمین کی بہاریں ہیں، وہ آسمان کی فضائیں۔ یہاں خلق کی قدرت دیکھو وہاں امر کی لذّت پاؤ۔ آنکھ یہاں کھلے جلوہ وہاں ملے کہ جلا فتیلہ روشنی جلد پکڑتا ہے۔ قدرت کی ہمہ گیریوں پر نظر ڈالو، درخت کا ایک پتّہ بھی اس کے علم کے بغیر نہیں ہلتا۔ جب تک اس کا حکم نہ ہو۔ طوفان آئے یا سیلاب، زمین ہلے یا پہاڑ گرے۔ غارتگری کی ان عام تباہیوں میں بھی، نرم و نازک پودوں کے تنے، مُنہ کی پھونک سے اڑجانے والے پتنگے اور ہلکی سی ہلکی چوٹ سے مرجانے والی چیونٹیاں۔ پہاڑ کے گرے ہوئے ٹیلوں، زمین کے پھٹے ہوئے تودوں، طوفان کے تھپیڑوں اور سیلاب کی بہادینے والی طغیانیوں میں زندہ و سلامت پائی گئی ہیں، تو اس قدرت والے کی بخشش و کرم کی نعمتیں اور انکی لذّتیں بھلا بیان ہوسکتی ہیں۔ جن کی کیفیتوں کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا اور نہ دل میں آئے نہ دماغ میں سمائے بات یہ ہے کہ مقدرات کا علم صرف اسی کو ہے۔ علم ہی نہیں قدرت بھی اُسی کی ہے۔ کوئی پوچھے، جب اچھائی اور بُرائی سب اس کی قدرت میں ہے تو پھر ہماری گرفت کیوں ہو؟ یہ گرفت اختیار و امتیاز کی قوتوں پر ہے کہ اچھائیوں اور برائیوں کے بتادینے کے باوجود، ہم نے جو پسند کیا وہ عمل میں آیا، اس کی قدرت سے، لیکن فعل ہمارا ہی ہوا۔ پھر کتنے دوسرے اسباب علل ہیں، جن کے ماتحت یہ افعال ظہور میں آتے ہیں۔ ہماری بساط چھوٹی، اس کا علم محیط۔ جنتوں کا خالق اور قدرتوں کا مالک وہ، ہم اگر اپنے خونِ جگر سے کوئی جنت بنائیں بھی تو وہ مصنوعی اور عارضی ہوگی حقیقی اور دائمی نہیں وہ محنتوں کو ضائع نہیں کرتا، جب تک اس کی قدرتوں انکار نہ ہو۔ تغیرات کے اس عالم میں ہر شے بدلتی رہتی ہے۔ کیا اپنی بنائی ہوئی جنت کی شادکامیوں کا یہ تقاضا نہیں؟ کہ ہم ممنونِ احسان ہوں اور اس کا شکر ادا کریں۔ جبکہ ان کامیابیوں کے ذرائع، یہ دل و دماغ اور قوت و حرکت سب اسی کا عطیہ ہیں۔ اور اس زمین کے اوپر اور نیچے جو کچھ ہے، سب اسی کا ہے۔ اس کی ان برکتوں سے فائدہ اُٹھانا اور شکریہ ادا نہ کرنا، در اصل ان حقیقتوں کا انکار ہے اور یہی انکار، سرکشی و بغاوت ہے۔

اس کے انجام کی ایک معمولی صورت، دنیا کی خسروی اور جہانداری بھی ہے۔ ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ اسی برطانیہ کو ملکۂ بحر ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ وہ جس کی سلطنت میں آفتاب کبھی غروب نہ ہو۔ اُسکے جاہ و جلال کا پوچھنا کیا؟ مگر ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کو یہ برطانی تاجدار بھی فراموش نہ کرسکے۔ اپنی عملداری کے عالم شباب میں جب ہند کے دارالحکومت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کیا گیا تو نئے شاہی محل کی تعمیر کے لئے دلّی کا ایک دور افتادہ علاقہ منتخب ہوا۔ آہ دلّی جو کتنی بار بنی، سنوری، لُٹی اور برباد ہوئی یہ کہانی پُرانی ہے۔ اس صدی کے شروع میں بھی دلّی پر نیا جوبن آیا۔ اور مغربی تہذیب کے جلوۂ بے محابا کا جو نکھار آنکھوں نے دیکھا۔ وہ دور کے جلووں کی حسرتیں بھی ساتھ لیتا گیا۔ شاہی محل کے باغ و چمن کی آرائش کا ذکر تھا، موجود حکمران اپنے پیشروؤں کی یاد کیوں مناتے؟ کیا ان کے پاس اپنی یادگار نہ تھی؟ نہیں بڑائی اس میں ہے کہ وہ دوسروں کی بڑائی تسلیم کرے۔ تاکہ مجموعی تصوّر سامنے آئے اور ترقیوں کا پورا اندازہ ہو۔ حوادث میں کسی سلسلے کا ٹوٹ جانا ایک ایسا حادثہ ہے جو نتیجے کو مشتبہ کردیتا ہے۔ چنانچہ مغلوں کی عظمتِ تعمیر اور ان کی چمن بندیوں کا اعتراف کرتے ہوئے، نئی دہلی کے معماروں نے اس شاہی محل کے احاطۂ چمن کو "مغل گارڈن" کا لقب دے کر ان کی یاد تازہ کردی۔ یہ خانۂ باغ روشن ہوا، اس گلشن رنگ و بو میں کیسے کیسے پھول کھلے اور دل و دماغ کے لئے جانِ فرحت اور تازگی راحت بنے۔ جن سے عزم کے حوصلے بڑھے، ہمت نے ہار پہنے، یادگار کو عظمت ملی اور

پھول کھلے مرجھائے، رُت آئے رُت جائے!

سہارن پور میں اُردو ہفتہ

انجمن ترقی اُردو سہارن پور کی ایک میٹنگ میں صوبائی انجمن کی ہدایت کے مطابق اُردو ہفتہ منانے کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام مرتب ہوا۔

۸ر جون کو ایک جلسہ و مشاعرہ جوبلی پارک میں منعقد ہوگا جس میں شہر اور ضلع کے نمایندگان اور بیرونی شعرا شرکت کریں گے۔ اُردو ہفتے کا یہ پروگرام ۸ر جون سے شروع ہوکر ۱۵ر جون کی شام کو ایک جلسے پر ختم ہوگا۔ جو ممبر سازی اس ہفتے میں ہوگی اس کی بنیاد پر اگست سنہ ۱۹۶۴ء میں جدید انتخاب ہوگا۔　　(ملاپ۔ دہلی)

شمسی طہرانی

"تیرے بعد"

(پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پُر ملال سے متاثر ہو کر)

مادرِ ہند ہے مصروفِ بُکا تیرے بعد
ہر طرف شورِ قیامت ہے بپا تیرے بعد
چاند نے پہنی سیاہی کی قبا تیرے بعد
چرخ نے پھینک دی تاروں کی ردا تیرے بعد
مطلعِ زیست پہ چھایا ہے غبارِ حسرت
چل رہی ہے غم و وحشت کی ہوا تیرے بعد
بند ہے ناطقۂ گردشِ افلاک و زمیں
سرد ہے ولولۂ صبح و مسا تیرے بعد
آج لُٹ یوسفِ گم گشتۂ کنعانِ وطن
خاک بر سر ہے زلیخائے وفا تیرے بعد
سونی سونی ہے شبستانِ محبت کی فضا
پھیکی پھیکی ہے ستاروں کی ضیا تیرے بعد
قصرِ گیتی میں اُمنڈ آیا ہے طوفانِ الم
گوشے گوشے میں ہے اک حشر بپا تیرے بعد
فتنۂ جنگ سے انساں کو بچانے والے
لیلیٔ امن ہوئی رشتہ بپا تیرے بعد
اے اہنسا کے پیمبر! تری عظمت کے نثار
حاجتِ وقت کرے کون روا تیرے بعد
گوتم و کرشن نے دُنیا کو دیا تھا جو کبھی
کون دے آج وہ پیغام بھلا تیرے بعد
تھا رواں جس کے سبب قافلۂ عیش و نشاط
نالۂ غم ہے وہ گلبانگِ درا تیرے بعد
اب وہ پھولوں کی مہک ہے نہ وہ کلیوں کی چٹک
باغ سے روٹھ گئی بادِ صبا تیرے بعد
خون روتی ہے ترے غم میں بہارِ گلشن
لب پہ بلبل کے ہے مرنے کی دُعا تیرے بعد
آج میخانہ سیہ پوش ہوا مثلِ حرم
بزمِ زنداں میں ہے کہرام بپا تیرے بعد
اب نہ وہ بادۂ سرجوش نہ مینا میں خروش
ہچکیاں لیتی ہے قلقل کی صدا تیرے بعد
جیسے اُبھرے گا نہ اب جذبۂ تعمیرِ حیات
یوں دھڑکتا ہے دلِ ارض و سما تیرے بعد
عرش اور فرش کی آنکھوں سے رواں ہیں آنسو
کتنی غمگیں ہے خدائی بخدا تیرے بعد
ملک الموت ہے سکتے میں خدا خیر کرے
منفعل ہے تری رحلت سے قضا تیرے بعد
آج سر پیٹ کے کہتی ہے یہ روحِ گاندھی
دیکھئے دیش کا انجام ہو کیا تیرے بعد

کرشن موہن

بُجھ گیا ہے چراغ محفل کا

(پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات حسرت آیات پر)

چل بسا ہے عزیز ہر دل کا — بجھ گیا ہے چراغ محفل کا
راہ میں چھوڑ کر گیا رہبر — کون دے گا نشان منزل کا
چھین کر لے گئی قضا ہم سے — آسرا رہنمائے کامل کا
چھا گیا تھا جنونِ مذہب پہ — حوصلہ ایک مردِ عاقل کا
اُس کی ہستی میں تھے بہم دونوں — جوش دریا کا، امن ساحل کا
مُحسنِ اخلاص و راستی کا حلیف — نورِ حق تھا حریف باطل کا
وہ محبت سے، استقامت سے — جیت لیتا تھا دل مقابل کا
کیوں نہ رہتا وہ غیر جانب دار — وقت قائل ہوا دلائل کا
ہر کہ و مہ تھا والہ و شیدا — اُس کی طبعِ فروغ مائل کا
حیف اب کون رہنما ہوگا — ہندیوں کے مزاجِ غافل کا

داغِ فرقت دیا ہے نہرو نے — ہو گئے ہیں دماغ و دل سُونے
اُس کے جانے سے آ گئی ہے خزاں — آہ چھوڑا چمن کو خوش بُو نے
اہلِ دُنیا کے دل میں چاہت سے — گھر کیا تھا دلیلِ دل جُو نے
ہند کا جوہرِ عظیم ہے وہ — اُس کی بابت کہا تھا باپُو نے
درسِ اُلفت دیا تھا عالم کو — ہند کے حکمرانِ خوش خو نے
دی اُسے شہرتِ بقائے دوام — اُس کی مقبولیت کے جادُو نے
ہادیٔ اتحاد و یک جہتی — ابتری سے بچا لیا تو نے
دیش کو دی ہے عظمتِ جاوید — تیری فکر و نظر، تگ و دُو نے
تو وہ انسان تھا کہ دشمن بھی — آ کے اکثر ترے قدم چھوئے
دُکھ ہمارے جو گھٹنے ہی کو تھے — تیرے مرنے سے ہو گئے دُونے

جوہرِ فکر و فن، جواہر لال — تیرے غم نے کیا ہمیں پامال
تو نے عہدِ وفا، وفا نہ کیا — چل دیا چھوڑ کر ہمیں بے حال
سارا عالم رہینِ ماتم ہے — چھا گیا ہے دلوں پہ رنج و ملال
آسماں نے بہا دئے آنسو — اور زمیں پہ بھی آ گیا بھونچال
اُٹھ گیا آج بزمِ گیتی سے — نوعِ انساں کا ایک خیر سگال
جس نے ایثارِ نفس کے بل پہ — گرتی دنیا کو بھی لیا تھا سنبھال
تو امر ہے رہے گی یاد تری — تا ابد مظہرِ جمال و جلال
شانتی میں بھی ایک شکتی ہے — تو نے ثابت کیا بہ عزم و خیال
تو تھا وہ گوہرِ جہاں افروز — جس سے روشن ہوئے ہیں علم و کمال
تجھ سا ہر دل عزیز راہ نما — پھر میسر ہو، لگ رہا ہے محال

ضو فگن اک چراغ تھا نہ رہا — پھول جو حسنِ باغ تھا نہ رہا
عاشقِ انقلاب و آزادی — دافعِ درد و داغ تھا نہ رہا
کرشن موہن ہماری محفل میں
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

سلام مچھلی شہری

شامِ غم

—— آج کس غم میں سیہ پوش ہیں گلہائے چمن
آج کس سوگ میں ہیں گریہ کناں گنگ و جمن
آج کیوں باندھے ہوئے سر سے ہمالہ ہے کفن
اتنا خاموش نظر آتا ہے کیوں آج وطن
بین کرتی ہیں ہوائیں تو فضائیں ماتم
سرنگوں آج ہے کیوں اپنا "ترنگا پرچم"

ملک افسردہ و تنہا سا نظر آتا ہے
جو بھی ہے درد میں ڈوبا سا نظر آتا ہے
ہر طرف غم کا نظارا سا نظر آتا ہے
کارواں وقت کا ٹھہرا سا نظر آتا ہے

جس نے آزادی کا لہرایا تھا پرچم — نہ رہا
ہائے کس طرح کہیں "رہبرِ اعظم" نہ رہا
جس نے روشن کئے بھارت کے سنہرے مینار
جس نے مضبوط کیا اہلِ وطن کا کردار
وہ جو تھا ہند کے فردوس کا سچا معمار
وہ جو تھا ملک کی ہر عظمتِ توریں پہ نثار
ہائے وہ آج ہمیں گریہ کناں چھوڑ گیا
جانے کیا بھول ہوئی ہم سے کہ منہ موڑ گیا

اُس کی آواز ہمہ گل تھی، ہمہ نغمہ تھی
زندگی اس کی ہمہ نور، ہمہ شعلہ تھی
اُس کی ہر سانس میں پھولوں بھری اک دُنیا تھی
کائنات اُس کے خیالات کا اک جلوہ تھی
اُس کی گفتار پہ پھولوں کی نزاکت تھی نثار
اُس کے کردار پہ تہذیب کی عظمت تھی نثار

آج وہ غم ہے کہ جس غم کا بیاں مشکل ہے
لفظ میں ڈھل سکے یہ سوزِ نہاں مشکل ہے
اور رُک جائے یہ سیلابِ فغاں مشکل ہے
آگ سینے میں لگے ہو نہ دُھواں مشکل ہے
دور تک اب نظر آتا نہیں خورشیدِ یقیں
ختم ہے ہند کی تاریخ کا "بابِ زریں"

پھر بھی سیاروں کو خورشید میں ڈھلنا ہوگا
سحرِ نو کو نئی تاریخ سے مچلنا ہوگا
غم کی خاموش فضاؤں سے نکلنا ہوگا
ذوقِ منزل سے تو برسوں ہمیں چلنا ہوگا
خوابِ نہرو کو حقیقت میں بدلنا ہے ہمیں
اپنی دھرتی ہی کو جنت میں بدلنا ہے ہمیں

شفق بھوپالی

ایک سوال؟

(ہمارے عظیم رہنما پنڈت نہرو کی وفات پر)

رات بھی بھیانک ہو
راستہ بھی مشکل ہو
تاک میں ہوں ہر جانب، ٹولیاں "لٹیروں" کی
ایک کارواں پھر بھی
سوئے منزلِ مقصود، بڑھ رہا ہو تیزی سے "نقشِ پا" پہ "رہبر" کے
ایسے میں اگر یارو! ساتھ چھوڑ دے "رہبر"
کارواں کا کیا ہوگا؟

نوحن جاتی

نہرو اک تاریخ

(سانیٹ)

آج اک تیرگی برستی ہے
آج ہر ایک دل ہے پژمردہ ——
ٹھہرا ٹھہرا سا ہے ہر اک لمحہ
آنکھ اک "نور" کو ترستی ہے

دل میں رہ رہ کے درد اُٹھتا ہے
آج ہر سو ہیں سوگ کے بادل
اور اب کوئی بھی نہیں ہلچل
سارا ماحول آج سوتا ہے

ایسا مرنا کسے نصیب ہوا
مر کے بھی جس کا نام زندہ ہے
جس کا ایک ایک کام زندہ ہے
مر کے بھی ہم سے جو قریب ہوا
نہرو تاریخ کا ہے اک عنوان
جس کا ہر باب ہے عظیم الشان

اُردو وزیرِ اعظم

بغیر نہرو کا بھارت، کاہے کسی نے سوچا ہوگا۔ لیکن ہمارے سوچنے، نہ سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو ہم سے روٹھ گیا۔ ہاں، ہمارا وزیرِ اعظم ہم سے روٹھ گیا، ہمارا اُردو وزیرِ اعظم ہم سے روٹھ گیا۔

ہاں، تو اُردو وزیرِ اعظم تھا، جواہر! تیری شستہ اُردو، بقول عبدالماجد دریا بادی، اب ہم کبھی نہ سُن پائیں گے۔ تیرا وہ عالی وقار لب و لہجہ، پُرجلال اندازِ گفتگو، تیری دلآویز مسکراہٹ ہائے اب کہاں!

ع: مادرِ ہند دُنیا تری لُٹ گئی۔ (اقبال کرشن)

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال سے ملک کے طول و عرض پر غم کے سیاہ بادل چھا گئے ہیں۔ اپنے محبوب رہنما کی جدائی سے ہر دل سوگوار ہے۔

گذشتہ چار پانچ روز میں ہمیں بے شمار تعزیتی قراردادیں موصول ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث ان سب کو چھاپنا ممکن نہیں۔ اس عنوان کے تحت ہم نے صرف ان اداروں اور افراد کے نام لکھ دئے ہیں جنھوں نے ہمیں یہ قراردادیں بھیجی ہیں۔ ——— (ادارہ)

(۱) انجمن ترقی اُردو شاخ، دہلی۔ حمیدہ سلطان صاحبہ جنرل سکریٹری
(۲) " " " امروہہ۔ ڈاکٹر احسان صاحب نائب صدر
(۳) " " " دیوبند۔ اعجاز احمد قاسمی سکریٹری
(۴) " " " بودھن۔ ساغر حیدر آبادی سکریٹری
(۵) " " " لکھنؤ۔ شجاعت علی سندیلوی سکریٹری
(۶) " " " گیا۔
(۷) بزم ادب جھنجھنوں۔ یوسف حسین سکریٹری
(۸) ہمدرد (وقف) دہلی۔
(۹) مسلم ریلیف اینڈ ویلفیر سوسائٹی جمشید پور۔

رسل ۹۲ برس کے ہو گئے

برٹرینڈ رسل مشہور فلاسفر اور باغی ۱۷/۱۸ مئی کو ۹۲ برس کے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے یوم ولادت کے موقع پر ایک بیان میں کہا کہ مشرق و مغرب میں کشیدگی کم ضرور ہوئی ہے لیکن خطرات باقی ہیں۔ انھوں نے یہ بیان اپنی قیام گاہ واقع ویلز سے دیا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے یوم ولادت کے موقع پر کوئی خاص پروگرام تیار نہیں کیا ہے کیونکہ میں اپنی تحریک پیس فاونڈیشن کے سلسلے میں مشغول ہوں جس کا مقصد ایسے مسائل کے حل میں مدد دینا ہے جو ایٹمی جنگ کا باعث ہو سکتے ہیں۔

نوبل پرائز حاصل کرنے والے باغی سال فلسفی نے کہا کہ اس وقت آدمی کا کام ایسے ذرائع تلاش کرنا ہے جس کی مدد سے امن حاصل کیا جا سکے۔ (قومی آواز)

جموں میں شب افسانہ

۱۸ مئی کو جموں میں پہلی بار ایک "شب افسانہ" منائی گئی جس میں چار مشہور افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ یہ پروگرام آرٹ، ثقافت اور زبانوں کی متعلق ریاستی اکیڈمی کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ (قومی آواز)

چکردھرپور انجمن کے دفتر اور لائبریری کی بربادی

گذشتہ فسادات میں چکردھرپور کی ریاستی انجمن ترقی اُردو کی شاخ کے دفتر پر بھی حملہ ہوا۔ انجمن کے کل کاغذات رجسٹر اور کل سامان برباد کر دیا گیا اور تحویل میں جو ایک سو روپیہ تھا وہ بھی لوٹ لیا گیا۔ انجمن کی ایک شاندار اُردو لائبریری تھی جس میں زیادہ تر ضخیم اور قیمتی کتابیں تھیں اس کو بھی جلا کر خاک کر دیا گیا۔ اندازہ ہے کہ انجمن کی اس شاخ کو ساڑھے تین ہزار روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔

انجمن کے عہدے داروں کو بھی بربریت کا شکار بنایا گیا اور انھیں بھی زبردست نقصان پہنچا۔ (سیاست جدید)

جیگی یونین یونیورسٹی کی ۶۰۰ ویں سالگرہ

پولینڈ کی اس قدیم ترین یونی ورسٹی کی ۶۰۰ ویں سالگرہ کی تقریبات کا آغاز ۹ مئی کو کریکو میں ہوا۔ چار براعظموں کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے نمایندوں نے اس جشن میں شرکت کی اور بہت سے ماہرین سائنس کو اس موقع پر یونی ورسٹی کی اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ اس تقریب میں پولینڈ کے وزیر برائے اعلیٰ تعلیم بھی شریک تھے یونی ورسٹی کے ریکٹر پروفیسر کیزی میرز لیپ نری کی افتتاحی تقریر کے بعد ۱۱ ممالک کے ۱۳ سائنسدانوں کو اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔

پولینڈ کی حکومت اس تقریب کی یادگار میں ڈاک کے خاص ٹکٹ بھی جاری کر رہی ہے۔

اس موقع پر ایک نمائش بھی ہوئی جس میں شرکاء جشن نے بڑی دلچسپی لی۔

کریکو یونیورسٹی نے علوم و فنون کی جو خدمات انجام دی ہیں ان پر پرسس کے پروفیسر لی گاف اور جینوا کے پروفیسر اسوس نے روشنی ڈالی۔

پاکستان میں ٹیگور کی ۱۰۳ ویں سال گرہ

ڈھاکہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۰۳ ویں سال گرہ پورے اجلال و احترام کے ساتھ منائی گئی۔ بہت سے ثقافتی اور ادبی اداروں نے اس سلسلے میں خاص تقریبات کا اہتمام کیا۔ فنون لطیفہ کی بلبل اکیڈمی کی تقریب میں پروفیسر محمد عبدالحی نے ٹیگور کے ادبی اور علمی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ مباحثہ کے بعد ایک ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ بنگال اکیڈمی کی طرف سے ایک مجلس مباحثہ کا اہتمام کیا گیا جس میں بتایا گیا کہ بنگالی ادب کو پروان چڑھانے میں ٹیگور کا کیا حصہ ہے۔ (قومی آواز)

کشمیر میں اردو کی توسیع کا پروگرام

جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی کے دفتر میں اردو کی مشاورتی کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا جس میں پروفیسر جے لال کول، میر غلام رسول نازکی، پروفیسر عبدالقادر سروری، قیصر قلندر، پروفیسر حبیب اللہ ابین کامل، اختر محی الدین اور محمد یوسف نے شرکت کی۔ اجلاس میں اکاڈمی کی طرف سے شایع ہونے والی اردو کتابوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے، اردو کی تصانیف کو وسعت دینے اور اردو زبان کی ترویج و توسیع کے کاموں کو بڑھاوا دینے کے معاملات پر بحث ہوئی۔ مشاورتی کمیٹی کے ممبران نے تجویز پیش کی کہ اکاڈمی کے اردو رسالہ "شیرازہ" کی طرف سے ہر سال سالنامے شایع کیے جائیں اور اس میں ریاست کی زبانوں کے ترجموں اور دوسری تخلیقات کو زیادہ جگہ دی جائے اور حکومت کے علمی اور تہذیبی اداروں سے استدعا کی جائے کہ وہ اس پرچہ کی فروخت بڑھانے میں تعاون کریں۔

یہ بھی تجویز کیا گیا کہ کشمیر میں ایک شب افسانہ، ایک شام غزل اور ایک شام نظم کا انتظام کیا جائے اور کل ہند پیمانہ کا ایک ایک مشاعرہ جموں اور سری نگر میں منعقد کیا جائے۔

(روشنی سری نگر)

آگرہ کی ثقافتی تاریخ

معلوم ہوا ہے کہ روس میں آگرہ کے ثقافتی ورثہ کے بارے میں ایک جامع کتاب چھاپی جائے گی۔ یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے اس کا روسی اور ہندی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے گا اور اسے بیک وقت روس اور ہندوستان میں چھاپا جائے گا۔

اس کتاب کے مصنف میکش اکبرآبادی ہیں جو ایک مشہور اردو شاعر ہیں۔ کتاب تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ۵۰ سال قبل کے آگرہ کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق آگرہ کی ثقافتی زندگی سے ہے اس میں مشاعروں، گوی سمیلنوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے میلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

آوازوں کا میوزیم

مغربی برلن کی سرکاری لائبریری میں ایک "آوازوں کا عجائب گھر" قائم کیا گیا ہے جہاں رابندر ناتھ ٹیگور، البرٹ آئنسٹائن، شہنشاہ ولیم دوم، ہنڈن برگ اور دیگر مشہور و معروف ہستیوں کی آوازوں کے ریکارڈ محفوظ رکھے ہیں۔ یہ ریکارڈ اکٹھا کرنا پروفیسر ولیم ڈوگن نے شروع کیا تھا جو اس ادارے کے سربراہ ہیں۔ جرمنی میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سبق پڑھانے کے لئے ریکارڈ استعمال کرنے شروع کیے۔ انہوں نے اداکاری، جرائم اور جانوروں کی آوازوں کے ریکارڈ بھی اکٹھے کیے ہیں۔ (ہمدرد دہلی)

اردو پرائمری مدارس، کنٹراپرائمری اسکولوں میں ضم کر دینے کی تحریک

ریاست میسور کے محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر کی آفس سے ریاست کے تمام ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسرس کے نام ایک میمو جاری ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پرائمری ایجوکیشن بورڈ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۶ ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء میں یہ تجویز منظور کی ہے کہ جہاں جہاں اس بات کا امکان ہے وہاں اردو پرائمری مدارس کنٹرا پرائمری مدارس میں ضم کر دئے جائیں۔ چونکہ اردو اسکولوں کی جداگانہ موجودگی سے پبلک فنڈ کا نقصان ہو رہا ہے اس لئے ریاست کے تمام ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسرس سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس تعلیمی سال کے آغاز یعنی ۱۹۶۴-۶۵ء سے مذکورہ کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اور ان اردو مدارس کی فہرست فوری طور پر پیش کی جائے جنھیں کنٹرا اسکولوں میں ضم کر دیا جا سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ قوم کے رہبر و رہنما اور ذمہ دار حضرات وقت کے اس اہم مسئلہ پر فوری توجہ دیں گے۔

حکیم محمد نور الحق جاوید۔ سابق ممبر مسلم ایجوکیشن اڈوائزری کمیٹی گورنمنٹ آف میسور، چامراج نگر (ضلع میسور)

انعامی مقابلہ

نوخواندہ افراد کے لئے کتابیں لکھنے کے گیارھویں انعامی مقابلے کے لئے مصنفوں اور ناشروں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی کتابیں پیش کریں۔

اس مقابلے کی تفصیلات مرکزی وزارت تعلیم ایس ڈبلیو دوم سیکشن نئی دہلی کے پتے پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

کتابیں یا مسودات موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ اگست مقرر کی گئی ہے۔ (قومی آواز)

مراسلات (گذشتہ سے پیوستہ)

ادیب اور فسادات

چنانچہ انسانی سماج کا نظام تضاد پر نہیں، تطبیق پر مبنی ہے۔ انسان اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات کی ایک اکائی ہے، اور کائنات کا پورا نظام باہمی کشش، نہ کہ کش مکش پر قائم ہے، سیاروں کے مابین تقابل نہیں، توازن کی کیفیت ہے، عناصر ایک دوسرے سے لڑ کر الگ الگ نہیں ہو رہے ہیں، ورنہ اب تک ہماری دنیا پاش پاش ہو چکی، بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک ہو رہے ہیں اور اس طرح ایک سے ایک نئے نئے مرکبات جنم لے رہے ہیں اور دنیا آگے کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ قدرت کا یہی قانون ارتقا انسانی معاشرے کی بھی حقیقی ترقی کا ضامن ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کے دماغ و دل اور دست و بازو نے تمدن و تہذیب کے جتنے بھی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ سب آپس کے توافق اور تعاون کا نتیجہ ہیں۔ آج بھی مغربی ذہن کی چیرہ دستیوں اور تباہ کاریوں کے باوجود تمام دنیا کے انسانوں کے درمیان وحشیانہ مجادلوں کے پیچھے پیچھے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے کام آنے کے کچھ نیم شعوری حاسّے اور جذبے موجود ہیں، کم از کم وسائل ارتباط کی فراوانی نے ایک دوسرے سے متعلق تجسّس ضرور پیدا کر دیا ہے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہ ہو کہ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں ہمارے ملکی ادب نے مفصلۂ بالا اخلاقی قدروں کو پامال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ افسانے، نظم، ناول، تنقید، ہر ادبی وسیلے سے، کبھی نفسیات کے بہانے، کبھی جمالیات کے حیلے اور کبھی اقتصادیات و عمرانیات کا نام لے کر ہر اس تہذیبی ادارے اور معاشرتی نظام کی تنقیص و تذلیل کی گئی جو ان اخلاقی قدروں کا صدیوں سے پاسباں چلا آرہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری انسانی روایات پرزے پرزے ہو گئیں، وہ سارے سماجی بندھن ٹوٹ بکھرے جو اب تک آدمی کو سمیٹے اور سنبھالے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ یہ سارے فتنے ایک رومانی تحریک کے ساتھ جگائے گئے جس کا بنیادی اصول تو یہ تھا کہ ہر طبقے کے خلاف دوسرے طبقے کے دل میں زیادہ سے زیادہ تلخی گھول دی جائے، ہر آدمی کو اپنے گھریلو پیار کا اتنا رسیا بنا دیا جائے کہ وہ دوسرے کے گھریلو پیار کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے، لیکن نعرہ لگایا سماجی انصاف، طبقاتی برابری اور امن و آسائش کا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خطرناک ذہنی تحاشی پیدا ہو گئی۔ جب ایک بار یہ ہوس سینوں میں اُتار دی گئی کہ سب سے مقدم اپنا حق ہے، ہر دوسرا آدمی اس حق کا غاصب ہے اور موہوم غاصب کے خون کی سرخی ہی حصولِ حق کی ضامن ہے ——— تو پھر یہ لطیفہ رونما ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ ہر شخص اپنے کو اہلِ حق تصور کر کے دوسرے پر اسے غاصب سمجھتے ہوئے جھپٹ پڑے۔ حقائق کے سنگلاخ میں آ کر رومان کا شیشۂ فریب جب ٹوٹتا ہے تو اس طرح سے چھلک ریزے اُڑتے ہی ہیں!

اگر یہ صحیح ہے، اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں، کہ ہر ادب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے، تو گذشتہ پچیس تیس برسوں میں ملکی ادب کے کردار پر میرے تبصرے کی تصدیق اس ناقابلِ تردید واقعے سے ہوتی ہے کہ موضوعِ گفتگو فسادات کی قاید و کارکن ہندوستانیوں کی وہی نسل ہے جس کی عمر اس وقت پینتیس سے پینتالیس کے درمیان ہے اور ان میں وہ نوجوان بھی بکثرت شامل ہیں جو ابھی پندرہ سے تیس کے درمیان ہی ہیں۔ ان فسادیوں کے ذہن کی تعمیر جس ادب سے ہوئی ہے وہ وہی ہے جس کا عنصر میں نے سطورِ بالا میں متعین کیا۔ اب یا تو یہ عذر پیش کیجیے کہ موجودہ نسل ادب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی، ورنہ مان لیجیے کہ ہمارے ادیبوں نے نادانستگی میں ان ہی خرابیوں کی پرورش کی ہے جنھیں فنا کرنے کے لئے انھوں نے قلم کاریاں کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری بات کا اقرار چاہے وہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو، زیادہ قرینِ عقل ہے۔ کیا ہمارے ادیب اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت پاتے ہیں کہ ایک طرف اپنی خطاؤں کا اعتراف کر لیں اور دوسری جانب تلافیِ مافات کے لئے کمربستہ ہو جائیں؟ دونوں ہی باتیں بڑی اذیت ناک ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ اذیت ناک وہ صورتِ حال ہے جس سے اس وقت پورا ملکی معاشرہ دوچار ہے۔ ایک سمت معاشرے کی زندگی ہے، دوسری سمت ادیب کا وقار۔ فیصلہ دشوار ہو سکتا ہے ناممکن نہیں۔ ادیبوں سے بہر حال ہمیں اس ریاضتِ نفس اور دیانتِ ضمیر اور صالحیتِ کردار کی توقع کرنی چاہیے جو ایسے انقلابی فیصلے کے لئے درکار ہیں! تب ہی وہ اس عظیم انسانی مہم پر روانہ ہو سکیں گے جو ایک پورے برِ صغیر کے بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارنے کے لئے ضروری ہے!!

(عبدالمغنی)

نوٹ: اس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی ہے کہ ادیب فسادات کو ختم کرنے میں کس طرح معاون ہو سکتے ہیں؟

(ادارہ)

آندھرا پردیش میں اُردو کی سرکاری حیثیت

"حیدرآباد میں اُردو کا مستقبل اطمینان بخش ہے"
"آندھرا پردیش میں اُردو کو تلگو کے برابر رتبہ حاصل ہے"
"آندھرا پردیش میں اُردو دوسری علاقائی زبان قرار دی گئی"
یہ اور اسی قسم کے بیان، مراسلے، اخبار کی خبریں متعدد مرتبہ

شائع ہو چکی اور ہوتی رہتی ہیں۔ ۲۸ر اپریل کو ایک مقامی اخبار میں یہ سُرخی نظر سے گزری: "آندھرا پردیش نے اُردو کو علاقائی زبان کا درجہ دے کر دوسری ریاستوں کی رہنمائی کی!" متن میں اسی دعوے کا اعادہ کیا گیا ہے۔

انجمن تحفظ اُردو کی حالیہ کانفرنس کے کھلے اجلاس میں میں نے اس دعوے کو چیلنج کرتے ہوئے ثبوت چاہا تھا کہ اُردو کو تلیگو کا مرتبہ حاصل ہے یا اُردو اور تلیگو سرکاری اعتبار سے مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔

قانون اور سرکاری اعلانوں کی مدبرانہ، ذو معنویت سے سرشار، جارگونی[1] اور پیچ دار عبارت کے باوجود یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آندھرا پردیش میں اُردو کا درجہ تلیگو کے مساوی قرار دیا جا چکا اور اُردو بھی اس ریاست کی علاقائی زبان بن چکی خوش فہمی بلکہ کسی قدر خود فریبی ہے۔

یہ بے شک صحیح ہے کہ اس پردیش کے بعض بڑے بڑے عہدیدار، لیڈر اور دانش ور اُردو سے سچی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ اُردو کے ساتھ قطعی مساویانہ نہیں، قریب مساویانہ اور فراخ دلانہ برتاؤ کیا جائے۔ مگر ہمدردی یا نیت الگ چیز ہے اور قانونی حقیقت جداگانہ چیز ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس پر کسی اُردو دوست قانون داں کو روشنی ڈالنی چاہیئے تاکہ مزید غلط فہمیاں اور تاویل بازیاں نہ ہو سکیں۔

ساری ریاست میں دن رات دوڑنے والی ہزاروں نیم سرکاری بسوں کے بورڈ/گرام میں اُردو کا ایک حرف بھی نہیں۔ بجلی کا سرکاری محکمہ چند مہینوں سے ایسے بل جاری کرنے لگا ہے جس میں تلیگو اور انگریزی کا استعمال ہوتا ہے، حالانکہ اُردو جاننے والے مگر تلیگو سے ناواقف بجلی کے صارف ہزاروں ہیں۔

ایسے پنشن پانے والے جو تلیگو نہیں جانتے نہ صرف ہزاروں ہیں بلکہ ان کی قطعی اکثریت ہے۔ چند مہینوں سے پنشن بل میں تلیگو کا اضافہ کر دیا گیا اور ان پنشن بلوں میں بھی صرف تلیگو اور انگریزی کا استعمال ہوتا ہے، اُردو کا ایک حرف بھی نہیں۔

ان حقیقتوں کے باوجود اُردو کی ترقی اور تحفظ کے اداروں کے کارپردازوں اور اُن سے زیادہ مقامی صحافت سے وابستہ لوگوں کا خود مغالطے میں مبتلا رہنا اور باہر سے آنے والے مشہور افراد یا لیڈروں کو غلط باور کرانا حیرت انگیز ہے۔ ایاز قدر خود شناس۔ ڈاکٹر جعفر حسن

نوٹ: "مراسلہ نگار کا اصرار تھا کہ مراسلے کی کتابت اسی طرح ہو جس طرح خود انہوں نے لکھی ہے۔"

(ادارہ)

---

[1] جارگونی، یورپی زبان (Jargoni) سے بنایا ہوا لفظ۔

محمد ابراہیم؟

ہماری زبان، ۱۵ر مئی، صفحہ ۴، کالم ۲، وسط۔

یہ "ابراہیم صاحب" کوئی مولوی نہ تھے، اشارہ محمد ابراہیم عینک ساز کی طرف ہے۔ ان کا کارخانہ عینک سازی آج سے ایک صدی قبل لکھنؤ کا مشہور ترین کارخانہ عینک تھا۔ ان کے لڑکے محمد اسحاق، محمد ایوب، محمد یعقوب، میرے زمانہ تک زندہ تھے۔ سب الگ الگ کارخانوں کے مالک۔ اور اسحاق مرحوم کا انتقال تو ابھی چند ہی سال ہوئے بڑی عمر پر پہنچ کر ہوا ہے۔ ان کے نواسے محمد یوسف اس وقت بھی لکھنؤ کے مشہور عینک ساز ہیں، اور امریکہ سے اسی فن کی اعلا ڈگری لا کر حضرت گنج میں ایک بڑی دوکان کے مالک ہیں۔

(عبدالماجد)

غزل سرائی چھوڑیئے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے بعض شاعروں نے بعض پرچوں کی ٹھیکے داری لے رکھی ہے، اور ہر ہر شمارے میں پورے ایک صفحے کی نسبان بھر کی غزلیں ہوتی ہیں۔ اسے میں پسند نہیں کرتا۔ غزل کا ہر شعر ایک پوری نظم کا، کہنا چاہیئے، عنوان ہوتا ہے۔ جب تک نئے موضوعات ذہن میں نہ آئیں غزل کے لیئے قلم مت اُٹھائیے۔ پُرانے موضوعات کی ہیرا پھیری سے کیا فائدہ۔

آج کے غزل گو شعرا میں سے بیش تر کو ہم تقطیع ساز کہہ سکتے ہیں۔ بے شک تقطیع سازی اور قافیہ پیمائی قابل قدر چیزیں ہیں۔ لیکن ان کو بیکار کی غزلوں میں تو نہیں ضایع کرنا چاہیئے۔ آپ عروض سے واقف ہیں، اچھے زباندان ہیں، تو پھر نظمیں کیوں نہیں لکھتے۔ یہ مندر سومنات ہے، یہ انڈیا گیٹ ہے، یہ بھاکڑا ننگل ہے، وہ دامودر وادی ہے، وہ درگاپور ہے ___ ان پر آپ تقطیع سازی کا کمال کیوں نہیں دکھاتے۔

آپ مختلف زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، اچھے شاعر ہیں تو پھر منظوم ترجمے کیوں نہیں کرتے۔ یہ ٹینی سن کی In memorium ہے، ورڈسورتھ کی We are Seven ہے، ٹیگور کا قومی ترانہ ہے، یہ سنسکرت زبان ہے، یہ تامل ہے، تیلگو ہے، ___ ان کا آپ ترجمہ کیوں نہیں کرتے۔

خدمت اردو زبان کی، اُردو ادب کی کیجئے۔ (گستاخ)

اُترپردیش میں اُردو سے بدسلوکی

دہلی کے روزنامہ ٹائمز آف انڈیا نے اُترپردیش میں اُردو کی حالتِ زار کے بارے میں "وطن کے علاقے میں اُردو سے سوتیلی ماں جیسا برتاؤ" کی سرخیوں کے ساتھ ایک خبر شایع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اپنے وطن میں اُردو سے ناخواندہ مہمان جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ ریاستی حکومت کا رویہ اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا ہے۔ وزارتِ تعلیم وقتاً فوقتاً اُردو کی زبانی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے لیکن اس نے اس کی ترقی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر سمپورنانند نے اعلان کیا کہ اردو کوئی زبان نہیں، ہندی کا ایک اسلوب ہے، پھر کرپلانی کمیٹی نے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ سفارش کر دی کہ اردو کو ہندی میں ضم کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے کانگریسی رہنما اُردو کا رشتہ مسلمانوں، مسلم لیگ اور تقسیم ملک سے جوڑتے ہیں۔ اس رویہ کی وجہ سے اُردو کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ریاست کے سررشتہ تعلیم نے ایک ہدایت جاری کی۔ کہ تمام اسکولوں میں تعلیم ہندی میں دی جائے گی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اسکولوں میں اُردو اور ہندی ذریعہ تعلیم تھیں۔ آٹھویں درجے تک اُردو والوں کو ہندی، اور ہندی والوں کو اُردو پڑھنا پڑتی تھی لیکن کانگریسی حکومت نے یہ احکام جاری کر دیے کہ اُردو صرف ان اسکولوں میں پڑھائی جائے جہاں اس کے پڑھنے والوں کی تعداد چالیس ہو۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کے احکام نظر انداز کر دیے گئے۔ کم سے کم ۹۰ فی صدی پرائمری اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں اکثریت اُردو بولنے والوں کی تھی۔ اب اُردو تقریباً دس فی صدی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سکنڈری اسکولوں میں اس کی تعلیم ہو ہی نہیں رہی ہے۔ سکنڈری اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کے لئے ٹیچروں کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو اردو نہیں دلاتے ہیں۔

اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی اقلیت نے سہ لسانی فارمولے کا خیر مقدم کیا تھا جس میں بچہ انگریزی اور ہندی کے ساتھ اپنی مادری زبان بھی پڑھ سکتا تھا۔ لیکن اس فارمولے کی ریاستی حکومت نے یہ گت بنائی کہ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندی اور انگریزی کے ساتھ بچے کو جنوبی ہندوستان کی کوئی زبان پڑھنا ہوگی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں نے تامل اور تلگو نہیں لی اور اس کی جگہ اُردو کے بجائے عام طور پر سنسکرت کو لیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اُردو کے علم برداروں میں آنند نرائن مُلا اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی جیسے ممتاز ہندوؤں یا کائستھوں نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اسے سب جانتے ہیں۔ اس فرقے نے درگا سہائے سرور، جگت موہن لال رواں، نوبت رائے نظر جیسے ادیب اور شاعر پیدا کئے۔

اس وقت بھی اُردو کے ممتاز ادیب اور شاعر موجود ہیں مثلاً راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، مُلا، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور کرشن چندر وغیرہ اردو کے شاعر آج کل جتنے مقبول اور کامیاب ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ اس زبان میں جدید خیالات کو سمونے کی بڑی طاقت ہے۔ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو ہندی کے قومی زبان بننے میں مدد مل سکتی ہے۔

اخبار نے آخر میں لکھا ہے کہ اگر ریاستی حکومت حوصلہ افزائی کرے۔ تو اُردو قومی اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

مالک رام کے اعزاز میں استقبالیہ

نئی دہلی ۲۷ر مئی۔ جناب مالک رام کو یورپ سے واپسی پر خوش آمدید کہنے کے لئے کل شام جناب جگن ناتھ آزاد کے دولت کدے پر ایک محفل منعقد کی گئی جس میں دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے شرکت فرمائی۔

جناب مالک رام نے قیام یورپ کے تاثرات سے متعلق ایک پُرمغز تقریر کی اور بتایا کہ یورپ کے کتب خانوں میں اُردو، فارسی اور عربی مخطوطات خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس وقت جبکہ مائکرو فلم کے ذریعے سے ہر مخطوطے کی نقل حاصل کی جا سکتی ہے۔ تحقیق کا کام کرنے والوں کے لئے میدان بہت وسیع ہو گیا ہے۔ آپ نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تحقیق کا کام بہت مشکل کام ہے اور اس کے لئے پتہ مارنا پڑتا ہے۔ آپ نے تحقیقی کام کرنے والوں کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ انھیں تحقیق کا کام کرتے ہوئے بڑے صبر، تحمل اور حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ "کاتا اور لے دوڑے" کے اصول کا اطلاق تحقیق کے کام پر نہیں ہو سکتا۔

عبدالحی

تبصرے

نوائے سیفیہ

شعبۂ اُردو سیفیہ ڈگری کالج بھوپال۔

سیفیہ ڈگری کالج بھوپال کے طلبہ نے "نوائے سیفیہ" کے نام سے اُردو کا ایک ماہنامہ جاری کیا ہے جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کی نگرانی میں اب تک اسکے تین شمارے شایع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر شمارہ اپریل ۶۴ء کا ہے۔

اس رسالہ کی اُٹھان شروع ہی سے اچھی رہی ہے اور ہر نیا شمارہ اپنے پیشرو کی نسبت صوری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ زیر نظر شمارہ بڑے سائز کے ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲ صفحوں کی بساط ہی کیا ہے لیکن پرچے کے مرتب کرنے والوں کی سلیقہ مندی اور لطیف ذوق کی داد دینا چاہیے کہ اتنے کم صفحوں میں بڑے کارآمد اور رنگا رنگ مضامین پیش کر دئے ہیں۔ ٹیپو سلطان کی علمی اور سماجی خدمات پر نصیر الدین ہاشمی صاحب کا مضمون اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن بہت مُفید ہے اور تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے اس سلسلے میں مزید تحقیقی کام کی دعوت دیتا ہے۔ حالی کی "مناجات بیوہ" پر عبدالقوی دسنوی صاحب نے اپنے مضمون میں حالی کے اُن ناقدین کو غلط ٹھہرایا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حالی کی شاعری شدت احساس سے عاری ہے۔ حالی "بامقصد" شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حساس دل بھی رکھتے تھے اور بقول دسنوی صاحب "بیوہ کی مناجات میں اُنھوں نے دُکھیاری بیوہ کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی بڑی فن کاری سے کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیوہ کی آپ بیتی نہیں بلکہ خود حالی پر سب کچھ بیت چکی ہے۔"

طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین میں "اقبال کا فلسفۂ خودی پر ایک اجمالی زاویہ" کے عنوان سے عمر حیات خاں کا مضمون اچھا ہے انہوں نے سادہ زبان میں فلسفہ کی ثقیل اور ناقابل فہم اصطلاحات کا سہارا لئے بغیر اقبال کے خودی کے تصور کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لا مرکزی پر احمد علی خاں (بی۔ اے فائنل) کا مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ آخری صفحے پر اُردو سے متعلق کارآمد اور دلچسپ خبریں ہیں۔ ایک بڑی خوبی اور امتیاز اس پرچہ کا یہ ہے کہ کالجوں اور اسکولوں سے نکلنے والے دوسرے پرچوں کی طرح اس میں غزلوں اور نظموں کی بہتات نہیں۔ سارے پرچے میں "نوائے سیفیہ" کے عنوان سے کبیر کوثر کی صرف ایک نظم ہے جو اچھی بھی ہے اور "بامقصد" بھی۔

مجموعی طور سے یہ پرچہ اُردو کے اچھے پرچوں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ امید ہے کہ اسکی اشاعت پابندی سے ہوتی رہے گی۔

(۲)

مجلۃ الجامعہ

مدیر: ملک سیف الرحمٰن

ناشر: جامعہ احمدیہ، ربوہ

زیر تبصرہ رسالہ جامعہ احمدیہ ربوہ کا علمی اور ادبی ترجمان ہے۔ ناشرین کا کہنا ہے کہ یہ رسالہ تیس ۳۰ سال پہلے جاری ہوا تھا لیکن درمیان میں اس کی اشاعت بند ہو گئی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس کی اشاعت پھر شروع ہو گئی ہے۔

سارے رسالہ پر "جماعتی" رنگ غالب ہے۔ بعض ایسے مضامین جن پر مخصوص نظریات سے الگ رہ کر خالص علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی تھی اس پرچہ میں شامل ہیں۔ "ام الالسنہ" اسی قسم کا مضمون ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے اور باوجود اس کے کہ مصنف کے معتقدات نے اس کو خالص علمی اور تحقیقی مضمون نہیں بننے دیا ہے۔ پھر بھی یہ مضمون خاصا دلچسپ اور معلومات افزا کہا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلے کا دوسرا مضمون "نئے عہد نامے کے سوالات کا ابتدائی تعارف" ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے ان تمام قدیمی مسودات کا سرسری تعارف پیش کیا ہے جن سے عہد نامہ جدید کی ترتیب و تدوین میں کام لیا گیا۔ یہ مضمون کارآمد اور معلومات افزا ہے۔

زیر نظر شمارے میں ایک خالص ادبی مضمون بھی ناصر نواز کا ہے جس کا عنوان ہے "اُردو غزل کی روایت اور ولی"۔ مضمون نگار نے دکن میں غزل گوئی کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے دکن میں اردو ادب کے تین دور قائم کئے ہیں۔ بہمنی دور، بیجاپور عادل شاہی اور گولکنڈہ قطب شاہی دور اور اورنگزیب کی فتح کے بعد اورنگ آبادی یا مغلیہ دور۔ ہر دور کے نمائندہ غزل گو شعراء کا نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے اور اُس دور کی غزل کی روایات اور لسانی خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آخر میں غزل کے ابوالآباء ولی دکنی کے غزلیہ کلام پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے اُردو غزل کی تاریخ میں اُن کے مقام اور اُردو غزل پر اُن کے احسانات پر روشنی ڈالی ہے۔

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے شایع کیا